ڈاکٹر محمد ارشد عثمان
اُستاد، شعبۂ اُردو
گورنمنٹ نیشنل کالج، کراچی

نادم سیتاپوری کی خاکہ نگاری

ABSTRACT

Naadim Seetapuri's sketch writing
By Dr. Muhammad Arshad Usman, Department of Urdu, Govt. National College, Karachi.

Syed Muhammad Azhar Naadim Sitapuri (1914-1983) is a renowned name in our literary history. He wrote many novels, short stories, sketches and research articles. He was an eminent journalist, too. One aspect of Nadim's works is his pen-sketches. He wrote sketches of various personalities. This article evalutes the pen-sketches written by Nadim Sitapuri, with a reference to the historical background of sketch-writing in Urdu.

اُردو میں خاکہ نگاری کا مختصر جائزہ: (الف)

خاکہ نگاری فنی لحاظ سے شخصیت نگاری کے ذیل میں آتی ہے۔ انگریزی میں اسکا متبادل Sketch Writing ہے۔ یہ ایک ایسی تحریر ہے جس میں مصنف ذاتی مشاہدے کو شگفتہ اسلوب میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ کردار کے بامعنی اور مثبت تاثر پیدا ہو جائے۔ خاکے کا بنیادی مقصد شخصیت کی متوازن عکاسی، تہذیبی حقائق کا انکشاف اور شخصی تاثر کی فنکارانہ پیش کش ہے۔

اُردو میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش تذکروں اور پھر محمد حسین آزاد کی تصنیف آبِ حیات میں ملتے ہیں۔ آزاد ہی وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے شعوری طور پر کوشش کی کہ شاعروں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے کلام کا انتخاب بھی شامل کیا جائے۔ آزاد نے باقاعدہ خاکے تو نہیں لکھے لیکن جو کچھ لکھا وہ خاکہ نگاری کے فن کے قریب قریب ہے۔ انہوں نے شخصیات، عہد اور تہذیب و تمدن کی زندہ عکاسی کی ہے۔

اُردو کا پہلا باقاعدہ خاکہ نگار مرزا فرحت اللہ بیگ کو قرار دیا جاتا ہے۔ مرزا فرحت کا تحریر کردہ خاکہ ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی زبانی کچھ میری زبانی'' ۱۹۲۷ء میں منظر عام پر آیا۔ اگرچہ اس طویل خاکے کو فنی بنیادوں پر خامیوں سے پر قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس میں بعض مقامات پر سوانحی خصوصیات بھی پیدا ہو گئی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ اُردو کا پہلا مکمل اور کامیاب خاکہ ہے جس میں فرحت نے اپنے استادِ محترم کی زندگی کے بیشتر پہلوؤں کو پیش کر دیا ہے۔ فرحت کی

دوسری تصنیف ''دلی کا یادگار مشاعرہ'' ہے جس میں انہوں نے آزاد کا رنگ اختیار کرتے ہوئے تذکرے اور خاکے کی خصوصیات کو یکجا کر دیا ہے۔ یہاں شخصیتوں کے خاکے نہیں ان کے عکس ملتے ہیں۔ فرحت نے دلی کا یادگار مشاعرہ، میں دہلی کی قدیم معاشرت وتمدن کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر عابد حسین نے ''کیا خوب آدمی تھا'' کے نام سے مختصر خاکوں کا مجموعہ ۱۹۴۱ء میں شائع کیا۔ یہ ریڈیائی خاکوں کا مجموعہ تھا۔ جس میں کل گیارہ خاکے شامل تھے۔ اس کتاب میں راشد الخیری، حالی، نذیر، چکبست، داغ، پریم چند، حکیم اجمل، ڈاکٹر انصاری، علامہ اقبال، سر راس مسعود، اور مولانا محمد علی جوہر کے خاکے شامل تھے جو ۱۹۲۹ء تا ۱۹۴۰ء کے دوران آل انڈیا ریڈیو سے پیش کیے گئے۔ یہ خاکے متنوع خصوصیات کی عکاسی کرتے ہیں کیونکہ ان کی تخلیق کا دورانیہ طویل اور تخلیق کار الگ الگ ہیں اس لیے ہر خاکہ دوسرے سے فنی وادبی اعتبار سے مختلف ہے۔ اس کتاب کا سب سے اہم خاکہ جے نندکمار کا ہے جو پریم چند پر تحریر کیا گیا۔ اس مختصر خاکے کے ذریعے جے نند نے پریم چند کی شخصیت کی بے باک عکاسی کی ہے۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب میں شخصیات کے فکر وفن اور شخصی مرقعے بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔

بشیر احمد ھاشمی کی کتاب ''گفت وشنید'' خاکہ نگاری کے ارتقاء کی اگلی کڑی ہے جو مئی ۱۹۴۳ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ بھی ریڈیائی خاکے ہیں اس میں مصنف نے عام پیشہ وروں کے خاکے تحریر کیے۔ جن میں بیرا، منشی پروفیسر وغیرہ شامل ہیں۔ یہ ایک نیا تجربہ تھا جو کہ کامیاب تو نہ ہو سکا لیکن خاکہ نگاری کو وسعت پذیر ضرور کر گیا۔

رشید احمد صدیقی کی کتب ''گنج ہائے گرانمایہ''، ''ہم نفسانِ رفتہ'' اور ''ذاکر صاحب'' اُردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہیں۔ رشید احمد صدیقی ہی وہ خاکہ نگار ہیں جنہوں نے اس فن کو رفعتوں سے آشنا کیا، اور خاکوں کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ گنج ہائے گرانمایہ میں تیرا خاکے ہیں جبکہ ہم نفسانِ رفتہ میں سات خاکے ہیں۔ ذاکر صاحب واحد خاکہ ہے۔ رشید احمد صدیقی خوبیوں کے بیان کرنے میں آسانی محسوس کرتے ہیں جبکہ خامیوں کو بیان کرنے سے کتراتے ہیں۔ وہ تصویر کا اصل رخ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے تاثرات بھی پیش کر دیتے ہیں۔

مولوی عبدالحق نے ''چند ہم عصر''، میں عظمت کردار کو اہمیت دی انہوں نے سرسید، حالی، اقبال اور محسن الملک جیسی شخصیات کے ساتھ ساتھ نور خان، نام دیو جیسے کرداروں کے خاکے بھی تحریر کیے۔ انہوں نے شخصیات کا مطالعہ، اس عہد کے کینوس کو سامنے رکھتے ہوئے کیا اور قاری کے سامنے پیش کر دیا۔ عبدالحق نے عام انسانی خوبیوں وصفات کو بھی اپنی پسندیدہ شخصیات میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

عصمت چغتائی کا تحریر کردہ خاکہ ''دوزخی'' اپنی فنی خوبیوں کی بنا پر اُردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں مثالی خاکوں

میں سے ایک ہے۔ عظیم بیگ چغتائی پر لکھے گئے اس خاکے میں عصمت نے بڑی بے باکی سے اپنے بھائی کی شخصیت کو اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری عظیم بیگ میں موجود تمام تر برائیوں کے باوجود ان سے ہمدردی محسوس کرنے لگتا ہے۔ عصمت نے اسرار الحق مجازؔ کا خاکہ بھی تحریر کیا ہے لیکن ادبی تاریخ میں اس کو زیادہ اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔

خاکہ نگاری میں اگلا نام سعادت حسن منٹو کا ہے جنہوں نے ''گنجے فرشتے'' جون ۱۹۵۲ء اور لاؤڈ اسپیکر'' جنوری ۱۹۵۵ء نامی کتابوں میں منتخب کردہ شخصیات کو اپنی تمام تر غلاظتوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انہوں نے قائداعظم، عصمت چغتائی، آغا حشر، نور جہاں، چراغ حسن حسرتؔ وغیرہ کے خاکے تحریر کیے۔ وہ شخصیت سے متعلق اپنے تاثر کو ابتداء ہی میں سامنے لے آتے ہیں۔ اپنے منفرد انداز اور اظہار کی بناء پر سعادت حسن منٹو کے خاکے بجا طور پر اُردو خاکہ نگاری میں منفرد مقام کے حامل ہیں۔

''ملکِ ادب کے شہزادے'' ڈاکٹر اعجاز حسین کی تحریر کردہ کتاب ہے جو ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی اس میں ۴۴ شعراء کے مختصر خاکے پیش کیے گئے ہیں۔ مصنف نے شخصیت سے متعلق اپنے ابتدائی تاثر کو پورے خاکے پر محیط کیا ہے یہی وجہ ہے کہ پیش کش کے اعتبار سے یہ خاکے کئی نقائص لیے ہوئے ہیں۔

جنوری ۱۹۵۵ء میں نقوش، لاہور نے شخصیات نمبر نکالا جس میں ۸۲ بلند پایہ ادبی شخصیات کے خاکے اشاعت پذیر ہوئے۔ خاکہ نگاروں نے اپنے اپنے انداز میں اپنی پسندیدہ شخصیات کو رسالے کے اوراق کی زینت بنایا۔

دسمبر ۱۹۵۵ء میں عبدالمجید سالک نے ''یاران کہن'' کے نام سے بیس خاکوں کا مجموعہ شائع کیا جس میں مولانا محمد علی، شوکت علی، علامہ اقبال وغیرہ پر خاکے تحریر کیے گئے۔ سالکؔ نے شخصیات کی مجلسی زندگی کی دریافت کرنے کی کوشش کی اور اسے شگفتہ انداز میں پیش کر دیا۔

اشرف صبوحی کی کتاب ''دلی کی چند عجیب ہستیاں'' پندرہ خاکوں پر مشتمل ہے جس میں انہوں نے غیر معروف شخصیات کو موضوع بنایا ہے۔ وہ عام لوگوں میں کھو کر سماج کے انوکھے زایوں کو دریافت کرنا چاہتی ہیں۔

جولائی ۱۹۶۱ء میں ضیاالدین احمد برنی نے ''عظمت رفتہ'' کے نام سے ۹۳ شخصیات کے مختصر خاکے شائع کیے۔ اس میں ایسی شخصیات کی متحرک تصویریں شامل ہیں جو کسی نہ کسی طور پر ہندوستان میں خاص اہمیت کے مالک رہے۔

۱۹۶۲ء میں شاہد احمد دہلوی کے تحریر کردہ خاکوں کا مجموعہ ''گنجینۂ گوہر'' اور ''بزم خوش نفساں'' شائع ہوئے۔ ان کا اسلوب، مرقع نگاری، اور تاثراتی انداز انہیں دیگر خاکہ نگاروں میں منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے میراجی، فراق، جوش،، منٹو اور تاثیر وغیرہ کے خاکے تحریر کیے۔ وہ اپنے قلم سے شخصیات کے نقوش پیش کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ محمد طفیل بھی اُردو خاکہ نگاری کی تاریخ کا ایک اہم نام ہیں جنہوں نے خاکہ نگاری کو باقاعدہ صنف اظہار کے طور پر

اپنایا۔انہوں نے منٹو، جوش، کرشن چندر وغیرہ کے خاکے تحریر کیے۔وہ اپنے مخصوص انداز میں شخصیت کو پرکھتے ہیں اور معنی ومفاہیم کے ساتھ پیش کردیتے ہیں۔ان خاکہ نگاروں کے علاوہ چراغ حسن حسرتؔ کی کتاب ''مردم دیدہ''، شوکت تھانوی کی ''شیش محل''، ممتاز مفتی کی کتاب ''پیاز کے چھلکے'' اور ''اوکھے لوگ''، مختار مسعود کی کتاب ''مینار پاکستان''، اور ''علی گڑھ'' اُردو خاکہ نگاری کے ارتقاء میں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اُردو میں خاکہ نگاری کی روایت زیادہ پرانی نہیں نہ ہی اس کا ادبی سرمایہ بہت زیادہ ہے لیکن اپنی گوناگوں خوبیوں اور اپنی بلند قامت تخلیقات کی بدولت یہ صنف ادب آج اعتبار حاصل کرچکی ہے۔

نادمؔ سیتاپوری بحیثیت خاکہ نگار

ضلع سیتاپور لکھنو کے وسط میں واقع ہے جس کا مرکزی شہر ''سیتاپور'' ایک قدیم اور تاریخی شہر ہے جو اپنے دیومالائی اور تاریخی پس منظر کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔رامائنی عہد کی روائتیں بتاتی ہیں کہ سیتاپور بھگوان ''رام'' کی بیوی ''سیتا'' کے نام سے موسوم ہے۔کہا جاتا ہے کہ ''سیتا''، ''رام'' کے ساتھ ایک زیارت کے دوران یہاں ٹھہری تھی بعد ازاں راجہ ''وکرما دت'' نے اس شہر کی بنیاد رکھی اور سیتاپور اس کا نام رکھا۔اس شہر کا تعلق دور قدیم، وسط اور جدید تاریخ سے ہے۔سادھوؤں اور صوفیوں کی سرزمین ہے۔اس مقدس مقام پر ''ویدویاس'' نے ''پران'' تخلیق کیے۔ہندو دیومالا کے مطابق ''پنچ دھم یاترا'' اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ ''نیم سار'' یا ''نیماشرن'' نا جایا جائے جو سیتاپور میں ہے۔سیتاپور کے بارے میں ابوالفضل نے آئینہ اکبری میں لکھا ہے کہ یہ علاقہ عہد اکبری میں ''چھتیاپور'' یا ''چتیا پور'' کہلاتا تھا۔قدیم تاریخ کے مطابق یہ مقام ''کوشل نریش'' کے بیٹے ''بدودابھ'' کے بعد راجہ ''مگدھ'' کی ''شینگناز'' ریاست میں شامل تھا۔نند اور موریا سلطنت کے زوال کے بعد یہ علاقہ ''شنگا سلطنت'' کے تحت چلا گیا تھا۔اس دور کے مٹی کے مجسمے تحصیل ''سدھولی'' سے دریافت ہوئے ہیں۔اسی طرح گپتا دور کے آثار ''بدیسار'' کی تحصیل ''مشرکھ'' سے ملے ہیں۔''نیماشرن'' کا مقدس مقام دریائے گومتی کے کنارے پر ہے جہاں مہارشی ویدیاس نے ''پران'' تخلیق کیے۔''ویدوں'' کے بعد کے زمانے کی ایک عظیم جامعہ کے آثار بھی اسی علاقے سے ملے ہیں جہاں اٹھاسی ہزار ''رشی''، ''شاستروں'' کی تعلیم حاصل کرتے تھے، ''شونک جی'' اس جامعہ کے رئیس تھے۔مغل دور میں لاہر پور اور خیرآباد اپنی مذہبی اور علمی حیثیت کی بنا پر مشہور تھے۔سولہویں صدی میں یہ علاقے فارسی، عربی اور سنسکرت کی زبانوں کے مرکز حصول علم رہے ہیں(۱)۔

علم وادب سے تعلق رکھنے والی بے شمار ہستیوں نے یہیں جنم لیا جنہوں نے اپنے علم وفن سے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ولی دکھنی کے زمانے میں بھی یہاں نہ صرف شعروشاعری کا چلن تھا بلکہ ریختہ گو حضرات بھی موجود تھے مشہور علمی وادبی شخصیات میں قاضی سید عبداللہ رضوی۔میر محمد آصف مشہدیؔ، فرزوقؔ ہند حضرت جریحؔ، میر مقرب حسین مقربؔ،

میر امتیاز علی محزونؔ، فردوسی ہند حضرت فارغؔ، حکیم محمد شریف طالبؔ، میر کاظم حسین وفاؔ، منشی علی رضا رضاؔ، میر ناظر حسین ناظرؔ منشی علی محمد نظمؔ، میر ظہور الحسن فروغؔ، میر محمد نزیر آزاد، احمد حسن ہاتف، مضطرؔ وسیم خیر آبادی اور ریاضؔ خیر آبادی اور مولوی شیخ اکرام علی (علامہ سیتا پوری) مترجم اخوان الصفا زیادہ مشہور ہیں جبکہ مشہور ہندی شاعر نارتم داس بھی سیتا پور کا رہائشی تھا، وہ تلسی داس کا ہم عصر تھا اس کی مشہور تخلیق ''سداما چرترا'' تھی۔ اس ضلع کی اور مشہور شخصیت راجا ٹوڈرمل کی ہے جو کہ شہنشاہ اکبر کے نورتن میں سے تھا اور وزیر لگان تھا۔ اچاریا نریندر ادیو بھی سیتا پور میں پیدا ہوا وہ ایک مشہور قوم پرست اور معلم تھا (۲)۔

سید محمد اظہر نادمؔ سیتا پوری اس تاریخی، علمی و ادبی شہر میں ۲۷ فروری ۱۹۱۴ء کو سادات سیتا پور کے ایک کے قابلِ ذکر خاندان میں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب آٹھویں امام حضرت امام رضا سے ملتا ہے۔ نادمؔ سیتا پوری کے جدِ اعلیٰ سید عبداللہ زربخش بن سید یعقوب بن سید ابوعبداللہ ۱۴۵۲ھ، ہجری میں ہندوستان آئے ابتدائی قیام لاہور میں رہا۔ کچھ دن یہاں قیام کے بعد اودھ کی طرف روانہ ہوئے اور قصبہ زید پور (ضلع بارہ بنکی یو۔پی) میں مستقل سکونت اختیار کی۔ سید عبداللہ کی اولاد میں جناب سید زید بہت مشہور ہوئے اور انہی کے نام پر قصبہ زید پور مشہور ہوا۔ جناب سید زید کی اولاد میں سے ایک بزرگ قاضی سید محمد تقی قصبہ کھیری (ضلع لکھیم پور کھیری یو۔پی) میں سکونت گزیں ہوئے۔ قاضی سید محمد تقی کے خاندان سے ایک بزرگ قاضی سید محمد اشرف بن قاضی سید اوحد قصبہ کھیری سے آکر سیتا پور میں آباد ہوئے اور محلہ قضیارہ آباد کیا۔ اسی محلہ میں جناب نادمؔ سیتا پوری نے جنم لیا اور اپنی زندگی کے ابتدائی ایام گزارے۔ عام رواج کے مطابق اپنی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی مکمل ہوئی۔ بعد میں مزید تعلیم کے لیے اسکول ''ہزارہ، پرائمری اسکول، سیتا پور'' میں داخل کرائے گئے۔ کلکتہ بورڈ سے ہومیو پیتھک ڈاکٹری کا کورس کیا، کچھ عرصہ ڈاکٹری بھی کی لیکن علم و ادب کی منزلیں انھیں اپنی جانب پکار رہیں تھیں لہذا اس ڈاکٹری کو خیر باد کہا اور لاہور کی جانب کوچ کیا جہاں انہوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا (۳)۔

نادمؔ سیتا پوری نے گرانقدر علمی و ادبی کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ غالبؔ پر نادمؔ کی تین کتابیں ''غالبؔ کے کلام میں الحاقی عناصر'' (۴) ''خیابان غالبؔ'' (۵) اور ''غالبؔ نام آورم'' (۶) بہت مقبول ہوئیں۔ ''فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی'' (۷) وہ کتاب ہے جس پر نادمؔ کو یوپی حکومت کی جانب سے نقد انعام سے بھی نوازا (۸) نادمؔ کی دیگر اہم تصانیف میں ''اکبرالہ آبادی کے لطیفے'' (۹) ''رابندر ناتھ ٹیگور'' (۱۰) ''انتخابِ فتنہ'' (۱۱) اور ''تلخیصِ مقدمۂ ابن خلدون'' (۱۲) شامل ہیں۔ نادمؔ نے افسانوی ادب میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کے ناولوں میں ''محل سرا'' (۱۳) ''ان سنی'' (۱۴) اور شہانہ'' (۱۵) مقبول ہوئے۔ ایک افسانوی مجموعہ ''منجدھار'' (۱۶) کو افسانوی ادب میں بڑی اہمیت حاصل ہے، تحریکِ پاکستان پر ان کی کتاب ''ہمارا پاکستان'' (۱۷) تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں نادمؔ نے مختلف مآخذ اور حقائق کی مدد سے تحریکِ پاکستان کے پس منظر اور مطالبۂ پاکستان کے عناصر کو واضح کیا ہے۔ اس کتاب کے

شائع ہوتے ہی برطانوی حکومت کی جانب سے پابندی عائد کردی گئی تھی۔ نادمؔ نے ہندوستانی صحافت اور اُردو پریس پر گرانقدر تحقیقی مقالات تحریر کیے۔ ان کے تحقیقی مضامین ومقالات کی تعداد سو سے زائد ہے۔ وہ ایک عرصے تک بہ حیثیت مزاحیہ کالم نویس پاکستان اور ہندوستان کے مختلف ادبی رسائل واخبارات سے منسلک رہے۔ انھوں نے ۱۹۳۲ء میں اپنی صحافتی زندگی کا آغاز روزنامہ ''اثناعشری''، لاہور سے کیا۔ ہفت روزہ ''ہاتف''، سیتاپور اور روزنامہ ''احرار''، لاہور نے ان کی صحافتی وادبی زندگی کی تعمیر وتشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ تقسیم ہند سے پہلے انہوں نے سیتاپور کے ہفت روزہ ''مستقبل''، بمبئی کے روزنامہ ''انقلاب''، سہ روزہ ''بیدار''، ہفت روزہ ''انڈیا''، ہفت روزہ ''آئینہ''، ہفت روزہ ''صداقت''، ماہنامہ ''صبح امید''، کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ اس کے علاوہ بھوپال کے روزنامہ ''سماج'' اور دہلی کے ماہنامہ ''جمالستان'' کے بھی ایڈیٹر رہے۔ اپنی صحافتی زندگی کے آخری ایّام میں وہ کان پور کے روزنامہ ''سیاست'' میں ''علامہ نکتہ رس'' کے قلمی نام سے مزاحیہ کالم اور کراچی کے ہفت روزہ ''عوامی عدالت'' میں بھی مزاحیہ کالم تحریر کرتے رہے۔ نادمؔ سیتاپوری کا انتقال ۱۸ مارچ ۱۹۸۳ء کو کراچی میں ہوا۔

نادمؔ سیتاپوری اپنی ذات میں انجمن تھے۔ ان کی زندگی تخلیق وتحقیق میں بسر ہوئی۔ فن وادب کی سرکردہ شخصیات سے واسطہ پڑتا رہا۔ نادمؔ سیتاپوری کا ان شخصیات سے جہاں ذاتی تعلق رہا وہیں علمی اور فنی حوالوں سے بھی وہ ان کے بہت قریب رہے۔ یہ قربت بعد میں نادمؔ کی تحریروں میں نظر آئی۔ نادمؔ کی تخلیقات اور ہمہ رنگ تحریروں میں مختلف شخصیات کے خاکے ابھر کر سامنے آئے۔ اگرچہ ان کے تحریر کردہ خاکوں کا کوئی مجموعہ تو شائع نہ ہوا لیکن مختلف رسائل میں ان کے تحریر کردہ خاکے شائع ہوئے۔ خاص طور پر ''یادش بخیر'' کے عنوان سے ''طلوع افکار''، کراچی، میں ۱۹۷۱ء کے دوران شائع ہونے والے خاکے اس سلسلے میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ نادمؔ کی شہرت کی بنیادی وجہ انکی تحقیقی خدمات ہیں لیکن ساتھ ہی ناول نگاری، افسانہ نویسی اور شاعری میں بھی ان کی تخلیقات منظر عام پر آئیں یہی وجہ ہے کہ نادمؔ کے تحریر کردہ خاکوں میں جہاں تحقیق کا عنصر نظر آتا ہے وہیں کہانی پن، ڈرامائیت اور مکالموں کا وجود بھی اپنی بہار دکھاتا ہے۔ وہ زیر موضوع شخصیت کے فن وذات کو ہی بیان کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اس بات کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ اس شخصیت سے متعلق زمانہ کے رجحانات وفن پر بھی معلومات قارئین کو فراہم کردی جائیں۔ ان کے تحریر کردہ خاکوں کی اہم اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے ان کے ذریعے اپنی ذات کے کئی اہم اور پوشیدہ حصوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ نادمؔ نے نے خصوصی طور پر سیتاپور سے تعلق رکھنے والی شخصیات کو اپنی تحریروں میں جگہ دی انہوں نے جہاں سیتاپور کی علمی وادبی تاریخ کو اپنے قلم کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کیا وہیں سیتاپور کی ان شخصیات کو بھی زندہ کردیا جنہیں کوئی نہیں جانتا تھا یا پھر زمانے کی تیز رفتار سواری نے ان کو ماضی کا حصہ بنا دیا تھا۔ اس کی نمایاں مثال ان کی تصنیف ''فورٹ ولیم کالج اور مولوی اکرام علی''

ہے۔جس میں انہوں نے نہ صرف مولوی اکرام علی کے ادبی کارناموں کو بیان کیا بلکہ ان کی شخصیت کی مختلف پرتیں بھی ہمارے سامنے پیش کردی ہیں۔نادمؔ کی خاکہ نگاری کا دوسرا پہلو ان کی تحقیق ہے۔انہوں نے جہاں علمی وادبی شخصیات کے فکروفن اور کارناموں پر تحقیق کی وہیں ان کی ذات وشخصیت کے مختلف پہلوؤں کو بھی بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اس کی کئی مثالیں ان کی تحریروں میں دیکھی جاسکتی ہیں مثلاً اختر الدولہ پر تحقیقی مقالہ تحریر کرتے ہوئے انہوں نے اخترؔ کی ذاتی زندگی کے نقوش بھی پیش کیے ہیں۔اس طرح نادمؔ کی تحریروں سے تحقیق کے عنصر کا نکال دیا جائے تو خاکہ نگاری و شخصیت نگاری کی عمدہ مثالیں تلاش کی جاسکتی ہیں۔مجموعی طور پر نادمؔ کے خاکے زندگی سے قریب اور شخصیات کے لیے مثبت انداز کے ساتھ وجود میں آتے ہیں۔آیئے نادمؔ کی خاکہ نگاری کا جائزہ لیتے ہیں۔نادمؔ کے تحریر کردہ خاکوں کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱)	سرسید اعظم مغل دربار میں	صبح امید، بمبئی	۱۹۴۶ء
۲)	اختر الدولہ	فروغِ اُردو، لکھنو	اکتوبر ۱۹۵۶ء
۳)	جگر بسوانی	ہماری زبان، علی گڑھ	۱۹۵۹ء
۴)	برادرم محترم	فروغ اُردو، لکھنو	۱۹۶۱ء
۵)	کچھ آسودگانِ خواب کے بارے میں	نگار، لکھنو	نومبر ۱۹۶۱ء
۶)	میرزا تقی ہوس اور خواجہ عشرت لکھنوی	ہماری زبان، علی گڑھ	جولائی ۱۹۶۲ء
۷)	افسر الشعراء آغا شاعر دہلوی	الشجاع	مارچ ۱۹۶۳ء
۸)	مرحوم	نقوش، لاہور	ستمبر ۱۹۶۳ء
۹)	نامی سیتاپوری	نیا دور، لکھنو	اکتوبر ۱۹۶۳ء
۱۰)	مردان علی خان رعنا	ہماری زبان، علی گڑھ	اکتوبر ۱۹۶۳ء
۱۱)	مضطر خیرآبادی	مجلس، لاہور	ستمبر ۱۹۶۴ء
۱۲)	عیش لکھنوی	نیا دور	اکتوبر ۱۹۶۴ء
۱۳)	مرمت خان مرمت عہد میر کا ایک گمنام شاعر	نقوش، لاہور	نومبر ۱۹۶۴ء
۱۴)	ہاشمی صاحب (ہاشمی نمبر)	سب رس، کراچی	جنوری ۱۹۶۵ء
۱۵)	مدار الدولہ نواب علی نقی خاں	نقوش، لاہور	جنوری ۱۹۶۶ء
۱۶)	غریق سیتاپوری	ماہنامہ مجلس، لاہور	اکتوبر ۱۹۶۷ء

۱۷) زمہری خیرآبادی	صحیفہ، لاہور	اکتوبر ۱۹۶۸ء
۱۸) علی عباس حسینی چند یادیں	افکار، کراچی	۱۹۶۹ء
۱۹) تذکرہئ شعرائے لکھنو اور خواجہ عشرت لکھنوی	قومی زبان، کراچی	جنوری ۱۹۷۰ء
۲۰) یادش بخیر علامہ شاداں بلگرامی	طلوعِ افکار، کراچی	جنوری ۱۹۷۱ء
۲۱) یادش بخیر اثر لکھنوی	طلوعِ افکار، کراچی	فروری ۱۹۷۱ء
۲۲) یادش بخیر محشر لکھنوی	طلوعِ افکار، کراچی	مارچ ۱۹۷۱ء
۲۳) یادش بخیر اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں	طلوعِ افکار، کراچی	مئی ۱۹۷۱ء
۲۴) یادش بخیر سید نصیر الدین ہاشمی	طلوعِ افکار، کراچی	جون ۱۹۷۱ء
۲۵) یادش بخیر ریاض خیرآبادی	طلوعِ افکار، کراچی	جولائی ۱۹۷۱ء
۲۶) یادش بخیر لکھنو کے چند ارباب کمال	طلوعِ افکار، کراچی	اگست ۱۹۷۱ء
۲۷) مولانا مہر سے پہلی اور آخری ملاقات	العلم، کراچی	مارچ ۱۹۷۲ء
۲۸) راجہ صاحب محمود آباد	روزنامہ مساوات	۶ نومبر ۱۹۷۴ء
۲۹) عبدالعزیز خالد	تحریریں، لاہور	اپریل ۱۹۷۵ء
۳۰) اگلے وقتوں کے لوگ	عوامی عدالت	۵ ستمبر ۱۹۷۵ء

پیشِ نظر فہرست میں نادؔم کے وہ تحقیقی مقالات بھی شامل ہیں جو انہوں نے مختلف شخصیات کے علمی و ادبی کارناموں پر تحقیق کرتے ہوئے تحریر کیے۔ لیکن ان مقالات میں خاکہ نگاری و شخصیت نگاری کے عمدہ نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔

نادؔم کے تحریر کردہ خاکوں کا فنی جائزہ

نادؔم سیتاپوری کے تحریر کردی خاکوں پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ نادؔم کے تحریر کردہ بیشتر خاکے، ان کے ذاتی تاثرات، تعلقات اور شخصیات کے فن پر ان کے مختصر تبصروں پر مشتمل ہیں۔ یوں نادؔم ایک تاثراتی خاکہ نگار نظر آتے ہیں۔ بظاہر نادؔم کے تحریر کردہ مضامین اور خاکوں میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی لیکن گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو نادؔم کی شخصیت کی طرح جو پرت در پرت تہوں پر مشتمل تھی، ان کے خاکے بھی اپنی خوبیوں اور خصوصیات کی پرتیں کھولنا شروع کر دیتے ہیں۔ نادؔم نے عمومی طور پر ایک مثبت تبصرہ نگار کے طور پر زیرِ موضوع شخصیت کی ذات و فن پر تبصرہ کیا ہے۔ انہوں نے معائب و محاسن میں سے صرف محاسن کو ہی اپنی تحریر کا حصہ بنایا ہے۔ معائب بیان کرنے سے گریز کیا ہے۔ وہ شخصیت کے ڈھکے چھپے گوشوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ شخصیت سے متعلق عمومی تاثر کو

پیش کرتے ہیں۔اس لحاظ سے نادؔم کے خاکے اپنے اندر ایک خامی بھی لیے ہوئے ہیں۔نادؔم نے غیر ضروری تفصیلات سے گریز کیا ہے۔وہ خود جو کچھ محسوس کرتے ہیں اپنے الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔نادؔم کی مرقع نگاری بھی اتنی گہری نہیں وہ شخصیت کے چہرے کے پیچھے موجود شخصیت کو ہمارے سامنے لے آئے۔وہ شخصیت کا تجزیہ کم ہی کرتے ہیں، خاص طور پر منفی پہلو بیان نہیں کرتے ہاں مثبت پہلو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ آپ شخصیت کے تمام محاسن سامنے آجائیں۔نادؔم سیتا پوری کے تحریر کردہ خاکوں کی اہم خصوصات درج ذیل ہیں۔

تاثراتی انداز

انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ جس شخص سے بھی ملتا ہے اس سے متعلق، کوئی نہ کوئی تاثر، اس میں ضرور ابھرتا ہے۔یہ تاثر یا تو منفی ہوتا ہے یا پھر مثبت۔یہی تاثر آگے جا کر ایک نقش بن جاتا ہے۔انہی نقوش کی روشنی میں دوسرے انسان کو جانچتا اور اس سے تعلقات استوار کرتا ہے۔نادؔم کیوں کہ ایک تخلیق کار ہیں وہ نہ صرف انسان کو دیکھ کر تاثر قائم کرتے ہیں بلکہ گہرائی تک اسے اور اس کے فن کو پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ نادؔم سیتا پوری کے تحریر کردہ خاکوں پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد جو پہلی خصوصیت ظاہر ہوتی ہے وہ خاکوں میں موجود تاثراتی انداز ہے۔نادؔم عام طور پر شخصیت کی ذات اور اس کے فن پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں۔وہ شخصیت کے متعلق اپنے ذاتی احساسات وتاثرات کو سامنے رکھتے ہوئے خاکہ تحریر کرتے ہیں۔نادؔم کے تحریر کردہ بیشتر خاکے کسی بھی شخصیت سے متعلق ان کے تاثرات کے آئینہ دار ہیں۔نادؔم نے باتوں باتوں میں جہاں اپنے احساسات وخیالات کا اظہار کیا ہے وہیں تہہ در تہہ شخصیت کی پرتیں کھولنے کی بھی کوشش کی ہے۔ان کے تحریر کردہ خاکوں کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ نادؔم قاری کو وہ سب کچھ بتانا چاہتے ہیں جو ان کے پاس شخصیت سے متعلق موجود ہے۔وہ تاثرات کی رو میں نہیں بہہ جاتے بلکہ شخصیت کا تجزیہ بھی اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری کے سامنے شخصیت کے وہ حصے بھی سامنے آجائیں جو عام طور پر پوشیدہ ہوتے ہیں مثلاً شوکت تھانوی سے متعلق ان کا یہ تبصرہ:

> ''شوکت بہت برا آدمی تھا۔۔۔اتنا برا کہ زندگی بھر سنجیدگی کے ساتھ کبھی اپنے کام نہیں آیا۔زندگی کا بیش قیمت حصہ ''یار باشی'' اور دوست نوازی میں گزار دیا، بلا سوچے ہوئے کہ ان دوستوں نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ دوستوں کے کام آنا شوکت کا خاک وخمیر تھا اور وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے موقعے تلاش کیا کرتے تھے کہ اپنے دوستوں کے کچھ کام آئیں۔(۱۸)''

اس تبصرہ سے جہاں شوکت تھانوی سے متعلق ان کے ذاتی تاثرات سامنے آئے ہیں وہیں شوکت تھانوی کی

ذات کا ایک خوبصورت پہلو بھی سامنے آ گیا ہے۔ یہی خوبی نادمؔ کو عمدہ خاکہ نگاروں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔ نادمؔ کا کمال یہ ہے کہ جہاں وہ زیر موضوع شخصیت کے فن و ذات کی پرتوں کو قاری کے سامنے کھولنے کی کوشش کرتے ہیں وہیں وہ علم و فن کی بے قدری اور علم و ادب سے متعلق شخصیات کی ناشناسی کا نوحہ بھی کہتے جاتے ہیں مثلاً ان کی یہ تحریر:

''لکھنو مٹ گیا! جانے کتنے ارباب کمال گمنامی کی فضاؤں میں گم ہو گئے۔ آج ان کا کوئی نام لینے والا بھی نہیں! (۱۹)''

اس مختصر سے جملے میں نادمؔ نے جہاں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے وہیں انہوں نے ایک تلخ سچائی کو بھی بیان کر دیا ہے۔ نادمؔ جہاں شخصیت پر اظہار رائے کرتے ہیں اور اپنے احساسات و تاثرات پیش کرتے ہیں۔ ادبی ماحول اور اس سے متعلق دیگر جزویات بھی ان کے خاکوں میں نظر آتی ہیں۔ لیکن ان کے پیش نظر شخصیت اور اس کا فن ہی رہتا ہے۔ زیر نظر مثال میں دیکھیے نادمؔ نے جگر بسوانی کے فن کے ساتھ ساتھ ان کی ذات کو بھی اپنی تحریر کا حصہ بنایا ہے:

''شاعر تو فطری تھے لیکن خداداد شعری صلاحیتوں کے باوجود انہوں نے اپنے فن کو کبھی اپنے لیے استعمال نہیں کیا۔ ساری توجہ شاگردوں پر صرف کر دیتے تھے یہاں تک کہ خود مشاعروں میں تہی دست پہنچتے (۲۰)۔''

نادمؔ کے تحریر کردہ بیشتر خاکے ان شخصیات سے متعلق ہیں جن سے نادم کے ذاتی اور قریبی تعلقات رہے یہ تعلقات ذاتی کے ساتھ ساتھ فنی نوعیت کے بھی تھے۔ اگرچہ تمام خاکوں میں نادمؔ نے اپنا مخصوص تاثراتی انداز اپنایا ہے لیکن یہ تاثرات عمومی طور پر مثبت ہی ہیں۔ انہوں نے کسی بھی شخصیت کی ذات اور فن پر منفی تنقید نہیں کی نہ ہی ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو شخصیت کی ذات و فن کو متنازع بنا دیں۔ محشرؔ لکھنوی پر ان کے خاکے سے یہ اقتباس اس کی ایک مثال ہے:

''محشرؔ قدیم لکھنو اسکول کے سب سے بڑے نمائندہ تھے۔ اس صدی کے آغاز میں معیار ادب کی طرف سے جب شعری رجحانات کے متعلق اصلاحی تحریک شروع کی گئی تو محشرؔ اس تحریک کا ساتھ نہ دے سکے۔ وہ اس تحریک کے مخالفین میں نہیں تھے لیکن ان کا ذہن و شعور قدیم طرز فکر سے کچھ اس طرح ہم آہنگ ہو چکا تھا کہ اسمیں کوئی خاص لوچ و لچک پیدا نہیں ہو سکی (۲۱)۔''

بیانیہ انداز

نادمؔ سیتاپوری کی تمام فنی تحریروں پر بیانیہ اسلوب کی چھاپ انتہائی گہری ہے۔ انہوں نے نثر کے جس میدان میں بھی طبع آزمائی کی ان کا انداز بیانیہ ہی رہا۔ ناول ہو کہ افسانہ، تنقید ہو کہ تحقیق یا مضامین نادمؔ بنیادی طور پر ایک بیانیہ

اسلوب نگار ہیں۔ان کی یہ خصوصیت خاکوں میں بھی نمایاں ہے۔وہ جہاں ایک طرف اپنے تاثرات واحساسات کوالفاظ کے قالب میں ڈھالتے ہیں وہیں محسوس یا غیر محسوس طور پران کا انداز بیانیہ ہوتا جاتا ہے۔وہ صرف شخصیت کو پیش کرنا چاہتے ہیں اس کے فن پر اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں ہے۔نادمؔ کی اس تحریر کو دیکھیے:

''جان بیٹا خلافت پہ دے دو''

اس تحریک کا قومی ترانہ تھا۔یہ بندے ماترم کا گیت تو اسلام دشمنی میں کانگریس نے بہت دنوں بعد اپنایا۔دراصل غیر منقسم ہندوستان میں آزادی کی روح خلافت تحریک سے پڑی اور''جان بیٹا خلافت پہ دیدو''اس جنگِ آزادی کا پہلا قومی ترانہ تھا۔

اس زمانے میں خلافت تحریک کے سلسلے میں بیشمار نظمیں کہی گئیں؟

بول گیا مائی لارڈ ککڑوں کوں،

فرنگی نامہ۔۔ڈھینچو ڈھینچو۔۔

دو،دو،ورق کی ایسی بے شمار کتابچے عام سڑکوں پر ایک ایک پیسے میں بکا کرتے تھے۔اور چوبے جی کو ان میں سے نجانے کتنی نظمیں زبانی یاد تھیں(۲۲)''

یہاں نادمؔ نے اپنے بچپن سے متعلق ایک شخصیت''چوبے مہاراج''سے متعلق اپنے یاداشتوں کو پیش کیا ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہ شخصیت کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس سیاسی ومعاشرتی ماحول کو بھی پیش کرتے جاتے ہیں جو شخصیت یا اس عہد سے متعلق ہے۔درحقیقت وہ بیانیہ انداز اختیار کرتے ہوئے وہ سب کچھ قاری تک پہنچانا چاہتے ہیں جو ان کے نزدیک قاری تک پہنچنا چاہئے۔راجہ صاحب محمود آباد سے متعلق خاکے میں انہوں نے راجہ صاحب کی شخصیت پر جو تبصرہ کیا ہے وہ بیانیہ طرز ادا کی ایک اور مثال ہے:

''سر مہاراجہ کی سیاسی سوجھ بوجھ صرف ۱۹۱۶ء لکھنو پیکٹ ہی سے پرکھی نہیں جاسکتی بلکہ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ قائداعظم کی پیشانی پر قائدانہ عظمت کے کتبے انہوں نے اس وقت پڑھ لیے تھے جب وہ مسلمانوں کے میدان سیاست میں براہِ راست داخل نہیں ہوئے تھے(۲۳)۔''

نادمؔ کا انداز اپنے پڑھنے والوں کو جہاں شخصیت سے متعلق آگاہی فراہم کرتا ہے وہیں ان کے ذاتی تاثرات و احساسات بھی سامنے آتے رہتے ہیں۔لیکن یہ ضرور ہے کہ خاکوں میں انہوں نے بیانیہ انداز اختیار کرتے ہوئے صرف

شخصیت کو ہی پیش نہیں کیا بلکہ اسلوب کا وہ انداز اختیار کیا ہے جو خاکہ کی جان ہوتا ہے وہ شخصیت کو بیان کرتے ہیں غیر اہم چیزوں کو اکثر نظر انداز کرتے جاتے ہیں اپنی ذات کی پرتیں بھی کھولی ہیں۔

واقعہ نگاری

اُردو خاکہ نگاری کے تاریخ میں یہ رجحان عام ہے کہ خاکہ نگار، زیر موضوع شخصیت کا خاکہ لکھتے وقت مختلف واقعات بھی اس طرح شامل کرتا ہے کہ قاری کو شخصیت میں دلچسپی بھی ہو محسوس ہو اور وہ پورے خاکے میں مجموعی طور پر دلچسپی لے۔ خاکہ نگار کی تخلیق اپنے پورے تاثر کے ساتھ قاری کے دل پر نقش ہو جائے۔ یہی رجحان نادمؔ کے خاکوں میں بھی واضح طور پر نظر آتا ہے۔ نادمؔ نے خاکوں میں جہاں مختلف واقعات تحریر کیے ہیں وہاں صاف طور پر نادمؔ کی فنی صلاحیتوں کا ایک رجحان، یعنی کہانی پن نمایاں طور پر ابھرتا ہے۔ نادمؔ کی فنی زندگی کے سفر میں ناول اور افسانے کی تخلیقات بھی نمایاں ہیں اگر چہ نادمؔ بحیثیت ایک کہانی نویس بہت زیادہ کامیاب نہ ہو سکے اور انہیں بہت زیادہ پذیرائی نہ مل سکی لیکن ان کی تحریروں میں یہ کہانی پن ابھرتا ضرور ہے خاص طور پر ان کے تحریر کردہ خاکے اس کا واضح اظہار ہیں۔ نادمؔ کی یہ تحریر دیکھیے:

> ''چائے اب ختم ہو چکی تھی کہنے لگے۔۔ یہ کاغذ لو۔۔ زرا دو چار گیت لکھ ڈالو جلدی سے گیت۔۔ کیسے گیت؟
> میں نے پوچھا کہنے لگے۔۔
> اماں ایسے ہی فضول سے گیت ''فوجی کمپون'' کو سنانے والے، جنہیں سن کر وہ جھومنے لگیں۔۔
> میں ''فضول سے گیت'' لکھنے لگا اور شوکت اپنے کام میں لگ گئے (۲۴)۔''

شوکت تھانوی کے خاکہ سے لیے گئے اس اقتباس سے دو چیزیں بہت واضح ہیں ایک تو واقعہ نگاری جس کو پلاٹ پر پھیلایا جائے تو پوری کہانی تشکیل دی جا سکتی ہے، دوم مکالمہ جو کہانیوں کی جان ہوا کرتا ہے۔ نادمؔ نے جہاں واقعات کو خاکوں کا حصہ بنایا ہے وہیں قاری کے لیے دو اہم خصوصیات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، ایک تو قاری کے لیے دلچسپی، دوم زیرِ موضوع شخصیت کی ذات کا تجزیہ۔ اس کی ایک اور مثال راجہ صاحب محمود آباد پر لکھے گئے خاکے کا یہ واقعہ بھی ہے:

> ''راجہ صاحب نے فرمایا کہ رخصتی کے وقت مجھے جگا دینا میں دولہن کو اپنی کار میں لے کر جاؤں گا۔ جاڑوں کی سرد ترین رات صبح پانچ بجے کے قریب اندر سے اطلاع آئی کہ دولہن تیار ہے۔ میں راجہ صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ریشمی

لحالف غائب۔ کھری نواڑی مسہری پر ریشمی گدااوڑھے لیٹے ہیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کی آنکھ کھل گئی۔ پوچھا کون؟ میں نے کہا میں ہوں۔ دولہن کی تیاری کی اطلاع دینے آیا ہوں۔ اور آپ کا لحاف کیا ہوا؟ لحاف فرمانے لگے وہ تو میں نے میاں جانی کو اڑھا دیا۔ اس بے چارے کو بہت سردی لگ رہی تھی! خوب ۔آپ نے فرمایا ہوتا ان کے لیے دوسرا لحاف آجاتا؟ میں حیرت واستعجاب کے ساتھ اس رحمدل انسان کی صورت دیکھتا رہ گیا (۲۵)۔''

اس واقعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نادؔم نے اس کے ذریعے قارئین کے لیے جہاں دلچسپی کا سامان پیدا کیا ہے وہیں انہوں نے راجہ صاحب کی شخصیت کا ایک اہم پہلو بیان کر دیا ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ نادؔم واقعہ لکھتے وقت زیرِموضوع شخصیت کی ذات کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ قاری کے سامنے شخصیت کی اہم خوبیاں کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ یوں قاری کے لیے آسان ہوجاتا ہے کہ وہ شخصیت کے بارے میں اپنی واضح رائے قائم کر سکے۔

مرقع نگاری

اُردو خاکہ نگاری کی ابتدائی اشکال کا جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدا ہی سے بیشتر خاکہ نگاروں نے زیر موضوع شخصیت کے ساتھ ساتھ ماحول، معاشرت، اور معاشرے کی مختلف اکائیوں کی مرقع نگاری کی کوشش کی ہے یہاں تک کہ بعض مصنفین واضح طور پر مرقع نگار بن کر ابھرے۔ انہوں نے لفظوں سے جیتی جاگتی تصویریں نقش کرنے کی کوشش کی اور بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ مرقع نگاری کی یہی کامیاب کوشش نادؔم سیتاپوری کے یہاں بھی ملتی ہے انہوں نے نہ صرف شخصیات کی مرقع نگاری کی ہے بلکہ انہوں نے ماحول ومعاشرت کے مرقعے بھی پیش کیے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ نادؔم کے بیشتر مرقع پارے واقعات کی شکل میں ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ نادؔم نے واقعات کے ذریعے جذبات واحساسات کا مجموعہ قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ انداز یہاں بھی تاثراتی، لیکن واقعاتی زیادہ ہے۔

''آخری عمر میں آنکھوں کی بصارت جاتی رہی تھی کسی نے پوچھا؟ کیا حال چال ہے بھائی فقیرے۔؟

ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔۔

حال جو کچھ ہے فقیرے کا عیاں راچہ بیاں آنکھیں جاتی رہیں اس عشق میں گریاں ہوکر (۲۶)

اگرچہ یہ مختصر مثال مرقع نگاری کے فن کو واضح کرنے کے لیے ناکافی ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ قاری کے سامنے

پوری تصویر سامنے اجاتی ہے۔ جوایک مرقع کے کامیاب ہونے کی سب سے اہم اورضروری شرط ہے۔ درج ذیل مثال دیکھیے۔

''جب مبتدیوں کی صف میں میرا نام پکارا گیا تو میں کانپ اٹھا اس سے پہلے اتنے بڑے مشاعرے میں غزل پڑھنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا۔ مجمع کا رعب بری طرح طاری تھا مگر اسی کے ساتھ مشاعرے میں غزل پڑھنے کا شوق بھی!

غزل پڑھنے کھڑا ہوا تو زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ کچھ تھوڑا بہت ترنم بھی تھا لیکن ہر مصرعہ فلمی گیت بنتا جا رہا تھا۔ جیسے تیسے دو چار شعر پڑھے بعض لوگوں نے مسکرا کر داد دی بعض نے قہقہہ لگا کر۔ غنیمت تھا کہ کسی نے ہوٹنگ نہیں کی ورنہ وہیں غش کھا کر گر پڑتا، مطلع اور کئی شعر مشاعرے کے سر سے گزر گئے لیکن ہکلاتے ہوئے جب میں اس شعر پر پہنچا۔۔

سمجھ کر عاشق دلگیر دکھلاؤ نہ تم اپنا جلوہ
سمجھنا میں نے اک احسان کیا مجبور انساں پر

تو وہی لکھنوی بزرگ جیسے اچانک چونک پڑے۔۔۔ ماشااللہ۔ سبحان اللہ میاں صاحبزادے پھر پڑھنا۔۔۔ شعر تو خیر جیسا تھا ظاہر ہے۔ لیکن اتنی بات ضرور تھی کی یہ شعر بلا شرکت غیرے میرا ہی تھا۔ اس کے کسی لفظ میں استاد سے اصلاح نہیں لی گئی تھی؟ خوشی سے میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس غیر متوقع ہمت افزائی سے مجھ میں ایک قسم کی طاقت وتوانائی آ گئی۔ اور میں نے کڑک دار ترنم میں تین مرتبہ اس شعر کا آموختہ سنا دیا۔ ان بزرگ کی دیکھا دیکھی کچھ اور لوگوں نے بھی تعریف کی ۔ میرے جسم سے کپکپاہٹ دور ہو چکی تھی اور بزعم خود اب میں بھی کچھ نظر آ رہا تھا۔ غزل ختم کر کے جب مجمع سے نکلا تو پتہ چلا کہ یہ بزرگ حضرت محشر لکھنوی تھے(۲۷)''

اس مثال سے واضح ہے کہ نادم نے جہاں واقعہ نگاری بڑی خوبی کے ساتھ کی ہے وہیں ان کی تحریر مرقع نگاری کی بھی ایک اہم مثال ہے۔ انہوں نے نہ صرف پورے مشاعرے کا ماحول ہمارے سامنے تمام تر اجزاء کے ساتھ پیش کیا ہے بلکہ ایک زندہ وجاوید تصویر ہمارے سامنے رکھ دی ہے۔

شخصیت نگاری

خاکہ نگاری کا سب سے اہم پہلو شخصیت نگاری ہے، کیوں کہ جب قاری خاکہ کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے سامنے زیرِ موضوع شخصیت کی ذات وفن اگرچہ دونوں ہوتے ہیں۔لیکن وہ خاکہ کا مطالعہ ہی شخصیت کو سامنے رکھ کر کرتا ہے۔اس لیے خاکہ نگار زیرِ موضوع شخصیت کی تمام پرتیں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔تاکہ قاری کے سامنے زیرِ موضوع شخصیت مکمل طور پر سامنے آجائے، نادمؔ سیتاپوری نے بھی اپنے تحریر کردہ خاکوں میں شخصیت نگاری کی اعلیٰ مثالیں پیش کی ہیں۔ انہوں نے زیرِ موضوع شخصیت کا پورا پورا حلیہ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔وہ طوالت سے گریز کرتے ہیں۔خاکہ لکھتے وقت شخصیت کا حلیہ، اس کا سراپا، چہرہ مہرہ، لباس، عادات ومشاغل کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں کہ پڑھنے والے کے سامنے اس کی ہو بہو تصویر کھنچ کر سامنے آجاتی ہے۔درج ذیل مثالیں دیکھیے۔

> ''میری عمر چار پانچ سال سے زیادہ نہ ہوگی جب میں نے پہلی بار ''چوبے مہاراج'' کو دیکھا۔بڑی بڑی مونچیں، داڑھی منڈی ہوئی، اتنے موٹے کہ ان کی دھوتی اکثر توند سے نیچے کھسکی ہوئی نظر آتی، ہاتھی کے کان والا جوتا پہنتے تھے۔کھدر کا کرتا اور کھدر ہی کی دھوتی ان کا مخصوص لباس تھا۔کاندھے پر ہر وقت کھدر یا گاڑھے کا انگوچھا پڑا رہتا تھا۔جیب میں نسوار کی ڈبیہ، تمباکو کے سوکھے پتے اور چنوئی ہر وقت رہتی تھی خشک تمباکو اور چونا ہتھیلی پر رکھ کر تھپتھپایا اور پھانک گئے۔ چٹکی بھر نسوار ڈبیا سے نکالی اور دونوں نتھنوں میں سڑک لی۔یہ ان کا ہر وقت کا معمول تھا(۲۸)''

> ''میں نے جب شاداں بلگرامی کو دیکھا تو ان کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی۔لمبا قد گندمی رنگت، تندرست قوی، خش خشی داڑھی۔چہرے پر ہلکے چیچک کے داغ تھے۔قلعہیٔ گوجر کے ایک مکان میں رہتے تھے۔دیال سنگھ اورنٹیل کالج کے شعبہ علوم مشرقی سے منسلک تھے۔کالج سے گھر آکر شیروانی کرتہ اور پائجامہ اتار کر تہبند باندھ لیا کرتے اور کھری چارپائی پر بیٹھ کر حقہ نوشی میں مصروف ہوجاتے (۲۹)''

> ''اچانک ایک یکہ کوٹھی میں داخل ہوا جس پر ایک فرشتہ صورت بزرگ تشریف فرما تھے۔دودھ جیسی گھنی داڑھی، روشن ومنور چہرہ، ترکی ٹوپی، شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے، پچھتر کے لپیٹے میں ہونگے ان کے ساتھ عقیل احمد جعفری بھی

تھے بغل میں کاغذ کا ایک بنڈل دبائے ہوئے۔ رسمی صاحب سلامت کے بعد دادا صاحب کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ یہ تھے حضرت ریاضؔ خیرآبادی (۳۰)''

''انھیں حضرات میں ایک گورے چٹے بزرگ اور بھی بیٹھے ہوئے تھے، خشخشی داڑھی سر پر پٹے، چکن کا سفید انگرکھا، غرارے دار پائجامہ، کوئی ساٹھ کے پیٹے میں ہونگے وضع قطع سے خالص لکھنوی معلوم ہوتے تھے، بے حد سنجیدہ، متین اور شائستہ، لکھنوی تہذیب کی منہ بولتی تصویر (۳۱)''

''بالکل ان پڑھ انگوٹھا ٹیک آدمی تھے اور سیتا پور کے تاریخی یکہ بان، پستہ قد، کالی رنگت، گھنی داڑھی، چوڑی دار پائجامہ، پرانی وضع کا کرتا، دو پلی ٹوپی! یہ سیتا پور کی تاریخ یکہ بانی کے باوا آدم کہے جاتے ہیں (۳۲)''

''وہ ادھیڑ عمر سے بھی کچھ آگے پہنچ چکے تھے، گہواں رنگ، منحنی جسم، میانہ قد، چھدری داڑھی، پرانی وضع کا گاڑے یا چارخانے کا کرتہ، دو پلی ٹوپی تہ بند زیادہ تر، پائجامہ کبھی کبھی (۳۳)''

''بہ اعتبار وضع قطع دوسرے حسرت موہانی تھے باتیں بہت جلدی جلدی کرتے تھے۔ اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں ایک والہانہ پن تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مجذوب ہیں (۳۴)''

نادمؔ سیتاپوری نے اپنے تحریر کردہ خاکوں میں جو مصوری کی ہے اور جو مرقع ہمارے سامنے پیش کیے ہیں، ان کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ انہوں شخصیت نگاری کرتے ہوئے زیر موضوع شخصیت کی حقیقی تصویریں پیش کردی ہیں۔ وہ طوالت سے گریز کرتے ہوئے شخصیت کا حلیہ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ شخصیت کی کم وبیش مکمل تصویر ہمارے سامنے آجائے وہ چاہتے تو اس کے لیے صفحات کے صفحات سیاہ کر ڈالتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں۔ سنہ ہی انہوں نے شخصیت کی ذاتی زندگی کے اوجھل لمحوں کو کریدنے کی کوشش کی ہے بلکہ جو کچھ بظاہر نظر آیا اس بیان کردیا۔

حقیقت نگاری

فن کے کسی بھی گوشے سے تعلق رکھنے والا فرد اپنے فن میں یہ کوشش ضرور کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس انسانی معاشرے میں موجود حقائق جو کہ عام طور پر تلخ ہی ہوتے ہیں، کو بیان کرے۔ اس کے لیے ہر ایک اپنے اپنے فن کے اعتبار سے اظہار کرتا ہے۔ نادمؔ ایک ادیب ہیں ان کی تمام تر ادبی تخلیقات میں حقیقت نگاری کی واضح جھلکیاں موجود ہیں۔

جہاں تک خاکوں کا تعلق ہے اگرچہ وخاکہ تحریر کرتے ہوئے صرف شخصیت کی ذات وفن کو ہی اپنا موضوع بناتے ہیں لیکن شخصیت کی ذات وفن کی اس طرح تصویر کشی کرتے ہیں کہ زیر موضوع شخصیت کی حقیقی ذات وفن سامنے آجائے۔ساتھ ہی ساتھ فن ومعاشرے کے مخفی یا ظاہر حقائق قارئین کے سامنے آجائیں۔یہ وجہ ہے کہ انہوں نے خاکہ تحریر کرتے ہوئے صرف شخصیت کی ذات وزندگی کو ہی پیش نہیں کیا بلکہ ہمارے معاشرے کے تلخ حقائق کو بھی پیش کیا ہے۔

''جنوری یا فروری ۱۹۶۹ء میں ملاقات ہوئی تو کہنے لگے۔

نادم صاحب۔اب میں آخری سانسیں لے رہا ہوں بتائے کہ مرزا رسوؔا، پر جو یہ مواد جمع کیا ہے اس کا کیا حشر ہوگا۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔پنساری کی دوکان پر ردی کے بھاؤ بک جائے گا؟ اور کیا ہوگا حشر!

علم وادب کے ساتھ ہمیشہ یہ ہی ہوتا رہا ہے اس سلسلے میں سوچنا ہی کیا(۳۵)''

اس مختصر سی عبارت میں نادمؔ نے ہمارے سامنے معاشرے کی کتنی بڑی تلخ سچائی کو پیش کر دیا ہے۔نادمؔ کے خاکوں کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے شخصیات کی ذات وفن کے مثبت پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔وہ منفی پہلوؤں کو بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں۔بنیادی طور پر نادمؔ حقیقت نگار ہیں۔وہ شخصیت سے متعلق اپنے تاثر کو پیش کرنے کے بعد فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیتے ہیں۔

''شوکت بہت برا آدمی تھا۔۔۔اتنا برا کہ زندگی بھر سنجیدگی کے ساتھ کبھی اپنے کام نہیں آیا۔زندگی کا بیش قیمت حصہ ''یار باشی'' اور دوست نوازی میں گزار دیا، بلا سوچے ہوئے کہ ان دوستوں نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ دوستوں کے کام آنا شوکت کا خاک وخمیر تھا اور وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے موقعے تلاش کیا کرتے تھے کہ اپنے دوستوں کے کچھ کام آئیں(۳۶)۔''

پیش نظر مثال سے نادمؔ کی حقیقت نگاری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔نادمؔ شخصیت کی ذات کو بیان کرتے ہوئے قاری سے چاہتے ہیں کہ وہ فیصلہ خود کرے کہ شخصیت کی ذات وفن کی قدر منزلت کس قدر ہے۔درج ذیل عبارت ملاحظہ کیجیے۔

''ریاض پابندی کے ساتھ صبح سویرے اس پائیں باغ میں بیٹھ کر دس گیارہ بجے تک ڈاک کا انتظار کیا کرتے تھے؟ اس آخری عمر میں انھیں انتظار تھا تو بس دو ہی چیزوں کا ڈاک کا اور موت کا؟(۳۷)''

اس عبارت میں موجود جو حسرت و یاس کی کیفیت موجود ہے اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ نادؔم نے انسانی زندگی کے حقائق کو اس طرح بیان کیا ہے کہ شخصیت کی حقیقی خوبیاں وصفات بھی سامنے آ گئی ہیں اور انسانی زندگی کے وہ تلخ حقائق بھی بیان ہو گئے ہیں جن سے نجات حاصل کرنا شائد ممکن نہیں۔

ذاتی احوال کا بیان

نادؔم سیتاپوری کے تحریر کردہ خاکے ان کے ذاتی تاثرات واحساسات کا آئینہ ہیں۔ اگر چہ یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ خاکہ نگاری کے دوران خاکہ نگار کی شخصیت محسوس یا غیر محسوس طور پر خاکوں میں نظر آتی ہے۔ لیکن ہر خاکہ نگار اپنے تحریر کردہ خاکوں کے حوالے سے اپنی مخصوص خصوصیات رکھتا ہے۔ کچھ خاکہ نگار زیر موضوع شخصیت کے بجائے خود کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے تحریر کردہ خاکوں میں شخصیات کے ساتھ ساتھ مصنف کی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ جبکہ بعض خاکہ نگار اپنی شخصیت کو پس پردہ رکھنا بہتر سمجھتے ہیں۔ نادؔم سیتاپوری کے تحریر کردہ خاکوں میں اگر چہ شخصیت کو اہمیت حاصل ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ کئی ایک مقامات پر نادؔم کی ذات ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نادؔم کی ذاتی زندگی کے کئی اہم گوشے مثلاً ان کا بچپن، ان کی ابتدائی فنی کاوشیں، ابتدائی زندگی کی اہم شخصیات اور غم روزگار دور کرنے کے ابتدائی کوششیں ان خاکوں کے ذریعے ہی سامنے آئے ہیں۔ اس سلسلے کا سب سے اہم خاکہ ''طلوع افکار''، کراچی، کے مئی ۱۹۷۱ء کے شمانے میں شائع ہونے والا خاکہ ''اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں'' ہے، جس میں نادؔم نے اپنی ابتدائی زندگی کے کرداروں ''ماما''، ''مولوی میر غلام عباس خوشتر'' اور ''چوبے مہاراج'' سے متعلق اپنی یادداشتوں کو قلم بند کیا ہے۔ یہ تینوں شخصیات نادؔم سیتاپوری کی ابتدائی زندگی کے وہ اوراق ہیں جنہیں شائد نادؔم کے علاوہ کوئی نہ جانتا تھا۔ ان خاکوں کے ذریعے جہاں نادؔم نے ان شخصیات کو موضوع بنایا ہے وہیں اپنی زندگی کے ابتدائی اوراق بھی قارئین کے سامنے پیش کر دیئے ہیں۔ مندرجہ ذیل مثالیں دیکھیے۔

> ''میری عمر سات آٹھ سال سے زیادہ نہ ہوگی جب میری اماں کا انتقال ہوا۔ اس وقت تک موت کے بارے میں میں اتنا ہی جانتا تھا کہ مرنے والا جنت چلا گیا ہے کچھ دنوں کے بعد گھوم پھر کر واپس آ جائے گا (۳۸)''
>
> ''ماما نے ہم کو ماں کا پیار اور باپ کی شفقتیں دیں۔ اس چاؤ چو چلے سے ہم دونوں بھائیوں کی پرورش کی کہ بھول کر بھی ہمیں اماں یاد نہ آئیں (۳۹)''
>
> ''میری عمر چار پانچ سال کی ہوگی۔ مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا گیا۔ بغدادی قائدے سے تعلیم کا آغاز ہوا اور قرآن مجید پر اختتام (۴۰)''

''روزانہ صبح سویرے میرے یہاں پہنچ جاتے اور کوٹھی کے احاطے میں اس وقت تک ٹہلا کرتے جب تک میں باہر نہ نکلتا ادھر میں گھر سے باہر نکلا انہوں نے بڑھ کر گود میں اٹھالیا اور ٹہلانے کے لیے ویب روڈ پہنچ گئے۔ یہ ویب روڈ جو میرے گھر کے سامنے سے دوڑتی بھاگتی سٹی اسٹیشن تک چلی جاتی تھی ایک قسم کی ''گرانڈ ٹرنک روڈ تھی (۴۱)''

ان عبارات میں نادمؔ کی زندگی کے ابتدائی نقوش واضح طور پر موجود ہیں۔ نادمؔ کے تحریر کردہ بیشتر خاکہ ان افراد سے متعلق ہیں جن سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ یا جن کا ان سے گہرا تعلق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ اپنے احساسات وجذبات تحریر کرنا شروع کرتے ہیں تو شخصیت سے اپنے تعلق کو بھی واضح طور پر بیان کرتے ہیں اور اس تعلق سے متعلق اپنی ذات کو بھی۔

''کوئی چونتیس پینتیس سال ادھر کی بات ہے جب میں نے ٹوٹی پھوٹی اُردو میں مضامین لکھنا شروع کیے تھے۔ کوئی میعاری رسالہ تو ان مضامین کو خاک چھاپتا۔ یہ ہی سمجھ میں آیا کہ ہاتھ صاف کرنے کے لیے روزنامہ ''ہمدم'' ہی پر ہاتھ صاف کیا جائے۔ شوکت اس زمانے میں ہمدم کے ادارہ تحریر سے وابستہ ہو چکے تھے (۴۲)''

قیام لاہور نادمؔ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے۔ نادمؔ نے اپنی فنی زندگی کا باقاعدہ آغاز یہیں سے کیا۔ ابھی انہوں نے اپنی تعلیم بھی مکمل نہیں کی تھی کہ انہوں نے خاموشی سے سیتاپور کو خیر باد کہا اور لاہور میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ علامہ شاداں بلگرامی کے خاکہ میں یہ سارا احوال موجود ہے۔

''میں ادھوری تعلیم چھوڑ کر جب لاہور پہنچا تو میرے سامنے زندگی کا کوئی ہموار راستہ نہیں تھا۔ تھوڑا بہت ادبی شوق بچپن سے تھا۔ اخبارات اور کتابیں پڑھ کر لکھنا بھی آ گیا تھا۔ مگر یہ سوال بہرحال سامنے تھا کہ لاہور میں مجھ جیسے انسان کا مستقبل کیا ہوگا؟ ایک واقف کار کے یہاں جا کر ٹھہر گیا۔ انہوں نے پرخلوص مہمانی فرمائی اور کہہ سن کر ایک نئے رونامے میں ملازمت دلوادی۔ روزنامہ اثنا عشری ان دونوں نیا نیا جاری ہوا تھا۔ سید ممتاز حسین خورجوی اس کے ایڈیٹر تھے اور ملک صادق علی عرفانی مالک! سید ممتاز حسین خورجوی، سید جالب دہلوی کے شاگرد اور اپنے عہد

کے کہنہ مشق صحافی۔ درجنوں اخبارات میں کام کر چکے تھے، پستہ قد۔ دبلے پتلے، خش خشی داڑھی، متبسم چہرہ۔ بے حد سنجیدہ، متین اومہذب بزرگ۔ میں جب ان کی خدمت میں پہنچا تو انہوں نے چھوٹے چھوٹے نوٹ لکھنے کا حکم دیا اور پھر چند روز کے بعد مزاحیہ کالم (تفریحات) بھی مجھ سے لکھوانے لگے (۴۳)''

خاکوں میں جہاں زیر موضوع شخصیت کی ذات وفن کو نادمؔ نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے وہیں انہوں نے اپنی زندگی کے اہم گوشوں کو بھی بے نقاب کیا ہے۔

۴ عصر کا بیان

ایک ادیب اور فنکار انتہائی حساس ہوتا ہے۔ وہ جس معاشرے کا حصہ ہوتا ہے اس کے نشیب وفراز، دکھ درد، غم اور خوشیاں، سب سے زیادہ اسی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ اثرات اس کے فن پر نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک فن کار اپنے زمانے کا مصور اور نمائندہ ہوتا ہے۔ اس کے فن میں حقیقی تاریخ نظر آتی ہے۔ خاص طور پر ادبی فن پارے ہمیں تاریخ کے ان اوراق سے روشناس کراتے ہیں جو عام طور پر نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ نادمؔ سیتاپوری کی فنی تخلیقات میں بھی تاریخ غیر محسوس طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے وہ بھی اپنے زمانے کے نمائندہ ہیں انہوں نے اپنے زمانے کے ماحول، تاریخ اور معاشرت سے ہمیں جانکاری دینے کے ساتھ ساتھ مختلف رجحانات سے بھی ہمیں روشناس کرایا ہے۔ نادمؔ نے شخصیت نگاری کے ساتھ ساتھ اس شخصیت سے متعلق دور کی کی بھی عکاسی کی ہے۔ اگر چہ وہ باقاعدہ تاریخ نویسی نہیں کرتے لیکن غیر رسمی طور پر زیر موضوع شخصیت کی ذات وفن پر تبصرہ کے ساتھ ساتھ اس دور سے تعلق رکھنے والے معاملات کو بھی بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔

''محشرؔ کی زندگی میں لکھنو کے کئی ادبی ولسانی ہنگامے ہوئے ''معرکہ چکبستؔ وشررؔ'' یاس عظیم آبادی اور عزیزؔ لکھنوی کی جنگ! آخری دور میں سراجؔ لکھنوی اور افقرؔ موہانی کی ادبی مقدمہ بازی۔ لیکن محشرؔ ان سب سے الگ رہے (۴۴)''

پیش نظر مثال میں نادمؔ نے محشر لکھنوی کے دور میں لکھنو میں ہونے والے ادبی ولسانی معرکوں کا ذکر کرتے ہوئے محشر لکھنوی کی شخصیت کے ایک مثبت پہلو کو بھی اجاگر کر دیا ہے۔ مندرجہ ذیل مثال دیکھیے۔

''آغا صاحب نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو لٹی ہوئی دلی بھی چراغ سحر کی طرح جھلملا رہی تھی۔ آزادؔ، حالیؔ، نذیرؔ احمد اور داغؔ دہلوی بھی گردش زمانہ کے ہاتھوں دلی چھوڑ چکے تھے (۴۵)''

یہاں نادمؔ نے انتہائی مختصر الفاظ میں دلی کی کیفیت بیان کردی ہے۔ دلی اجڑ رہا ہے اور فن سے وابستہ اہم شخصیات اپنی جانیں بچانے کے لیے، اور متاعِ عزیز، فن کی خاطر یہاں سے رخصت ہو رہی ہیں۔ زمانے کی گردش نے دلی کو تو اجاڑ ہی دیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہاں زندگی کا سانس سے ناطہ جڑا رکھنا مشکل ہو چکا ہے۔ اور عوام و خواص یہاں سے مختلف جگہوں کی طرف ہجرت کرتے جا رہے ہیں۔

''یہ وہ زمانہ تھا جب اودھ کے ہر تعلق دار کی مسندِ امارت درباریوں کے ہجوم سے گھری رہتی۔ ہر رئیس کے یہاں ایک دو شاعر مستقل طور پر ضرور رہتے، جگرؔ بھی راجہ نوشاد علی نوشاد کے دربار سے وابستہ ہو گئے (۴۶)''

درج بالا مثال سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی مرکزی حکومت کے خاتمہ کے بعد جو چھوٹی چھوٹی ریاستیں وجود میں آئیں اور جو چھوٹے چھوٹے حکمران وجود میں آئے، ان کے دربار بھی علم و ہنر سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے ایک جائے پناہ بن گئے تھے۔ جہاں فن بھی تخلیق کیا جا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ زندگی کی گاڑی کو بھی آگے دھکیلا جا رہا تھا۔ نادمؔ نے نہ صرف فن و تاریخ کے حوالے سے متعلقہ زمانے کو بیان کیا ہے بلکہ انہوں نے ادوار کی معاشرت و رہن سہن کا بھی تذکرہ اپنے تحریر کردہ خاکوں میں کیا ہے۔

''اس دور کے پنجاب میں سچ مچ دودھ کی نہریں بہتی تھیں۔ نہ اس زمانے تک خالص آدمیوں کی کمی تھی اور نہ خالص دودھ گھی کی۔ چھ پیسے میں لسی کا لبریز جہازی سائز گلاس ملتا تھا۔ ایک آنے میں بڑی تندوری روٹی۔ ایک آنہ ڈیڑھ آنے میں تلی ہوئی مچھلی کا بڑا سا پیس۔ ایک پیسے میں ابلا ہوا انڈا اور چلغوزے، اخروٹ، بادام اور کاجو تو اتنے سستے تھے کہ شائد یوپی میں مونگ پھلی بھی اس بھاؤ کبھی نہ بکی ہوگی (۴۷)''

علامہ شاداںؔ بلگرامی کے ہی خاکہ میں ایک اور جگہ انہوں نے لاہور کے اس دور کا تذکرہ کیا ہے جب لاہور برصغیر کی تاریخی شخصیات کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ ادب و ثقافت کے اعتبار سے لاہور پورے ہندوستان میں ایک ممتاز مقام حاصل کر چکا تھا۔ یہاں کے روز و شب سیاسی، ثقافتی اور فنی اعتبار سے ایک نئی تاریخ رقم کر رہے تھے۔

''لاہور کے ہر گلی کوچہ میں صحافت، ادب اور ثقافت کا چرچا تھا۔ شام کے وقت انار کلی کی ادبی رونق اس وقت اور بڑھ جاتی جب شیخ غلام علی تاجر کتب کی دوکان (لوہاری گیٹ) پر علامہ اقبالؔ، شاداںؔ بلگرامی، اور تاجورؔ نجیب آبادی وغیرہ پہنچ

جاتے (۴۸)''

غرض کہا جاسکتا ہے کہ نادؔم نے اگرچہ خاکوں میں باقاعدہ تاریخ کو موضوع نہیں بنایا لیکن انہوں نے شخصیات سے متعلق ادوار کی اس طرح عکاسی کی ہے کہ ان کے خاکے تاریخ کے حوالے سے بھی اہمیت حاصل کر گئے ہیں۔

تنقیدی تبصرے

نادؔم تخلیقات وفن پاروں پر نظر ڈالی جائے تو نادؔم کے فن کی کئی جہتیں ہمارے سامنے پرت در پرت کھلتی چلی جاتی ہیں۔انہیں میں سے ایک نادؔم کا تنقیدی صلاحیتیں ہیں۔اگر وہ باقاعدہ تنقید نگاری کرتے تو شائد زیادہ کامیاب ہوتے۔لیکن انہوں نے تحقیق پر اپنی توجہ مرکوز رکھی یا پھر ابتدائی دور میں کہانی نویسی پر۔ جہاں تک نادؔم کی تنقید کا تعلق ہے۔نادؔم کے تحریر کردہ خاکوں میں ان کے تنقیدی تبصرے، نادؔم کو باقاعدہ تنقید نگاروں کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔نادؔم نے اپنے تحریر کردہ خاکوں میں نہ صرف زیرِ موضوع شخصیت کی ذات وشخصیت کو موضوع بنایا ہے بلکہ جابجا ان شخصیات کے فن کو بھی موضوع بنایا ہے۔انہوں نے جہاں جہاں شخصیت کے فن پر تبصرہ کیا ہے اس کا رنگ تنقیدی انداز اختیار کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔انہوں نے بے لاگ تبصرے نہیں کیے۔ بلکہ ان کے سامنے شخصیت کا فن مکمل طور پر ایک کھلی کتاب کی مانند نظر آتا ہے جو انہیں مجبور کرتا ہے کہ فن کی قدر ومنزلت کے ساتھ ساتھ وہ اس کے اہم فنی خصائص بھی بیان کریں۔اس طرح اپنے تحریر کردہ خاکوں میں تنقیدی انداز میں فن اور فنکار کو زیر بحث لا کر نادؔم نے اپنے پڑھنے والوں کے لیے زیر موضوع شخصیت کے فن پر اپنے جامع تبصرے بھی پیش کر دیئے ہیں۔اس طرح قاری کے لیے فن اور فن کار دونوں پر اپنی مکمل رائے اور تاثر کا قائم کرنا آسان ہو گیا ہے۔غریقؔ سیتاپوری کے فن پر کیا گیا تبصرہ پر نظر ڈالیے۔

''غریق کا کلام ہوسکتا ہے آج کی نئی قدروں سے کچھ زیادہ ہم آہنگ نہ ہو
پھر بھی قدیم رنگِ غزل گوئی کی پوری چھاپ ان کے کلام پر لگی ہوئی
ہے(۴۹)''

نادؔم نے نہ صرف قدیم وجدید فنی قدروں کا ادراک رکھتے ہیں بلکہ اس حوالے سے غریقؔ سیتاپوری کی تخلیقات کو بھی پرکھ چکے ہیں۔نادؔم اپنے پڑھنے والوں کو دعوت عام بھی دیتے جارہے ہیں کہ وہ شخصیت کا خاکہ پڑھیں۔اور اس کے بعد اس کے فنی تخلیقات پر بھی نظر ڈالیں تاکہ فن اور فن کار کی شخصیت سامنے آسکے اور شخصیت کی قدر منزلت کا اندازہ کیا جاسکے۔ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے۔

''آغا شاعر کا آرٹ اور فن اپنی خصوصیات کے اعتبار سے اس کا مستحق کہ کہ اس کے
ہر شعبے کا تنقیدی جائزہ علیحدہ علیحدہ لیا جائے۔ان کا فن، صحافتی شعور، اور تمثیل نگاری

کی خداداد صلاحیتیں ایسی نہیں ہیں کہ جنھیں اس طرح نظر انداز کر دیا جائے کہ چند روز میں اُردو ادب کی تاریخ میں آغا شاعر کا نام بھی کہیں نظر نہ آئے (۵۰)''

درحقیقت نادمؔ کا انداز غیر جانبدارانہ تبصرہ نگار کا ہے۔ وہ منفی تبصرے نہیں کرتے۔ بلکہ مثبت انداز میں شخصیت کی فنی خوبیوں کو سامنے لاتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ شخصیت کے فن کے مثبت پہلو سامنے آجائیں۔۔

''ظریفؔ لکھنوی اپنے عہد میں ہزل کے تاجدار تھے۔ ان کے طرز فکر نے بتدریج قدیم ہزل سے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ وہ اپنے ہم عصر اکبرؔ الہ آبادی کی طرح سیاسیات حاضرہ اور قومی مسائل پر بھی سنجیدہ طنز کرنے لگے (۵۱)''

نادمؔ کے تحریر کردہ بیشتر خاکے ادب سے متعلق شخصیات کے ہیں۔ انہوں نے ایک ہمدرد خاکہ نگار و تنقید نگار کے طور پر زیر موضوع شخصیات پر مثبت تبصرے کیے ہیں۔ وہ منفی تبصرے نہیں کرتے نہ ہی شخصیت کی ذاتی و فنی زندگی کے منفی پہلو سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کے تحریر کردہ خاکوں میں منفی انداز نظر نہیں آتا۔ درج ذیل مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

''غالب پر مولانا مہر نے جس تحقیقی کام کا آغاز کیا تھا بلاشبہ اس سے غالبیات پر کام کرنے والوں کو ایک روشنی ملی، انہوں نے بہت حد تک تحقیق و تنقید کے بنیادی تقاضوں کو ایک نئی زندگی بخشی! اور تاریخ کو کئی ایسے موضوعات تفویض فرمائے جن پر کام کرنے والے اگر سنجیدہ روی کو مشعل راہ بنائے رہے تو تاریخ استدلال کی اساس و بنیاد پر اپنی منزل وے قر'' خالدؔ صاحب روائتی غزل کے شاعر نہیں ہیں۔ ان کی نظمیں حالیؔ۔ آزادؔ اور چکبستؔ کے رنگ کا چربہ بھی نہیں ہیں۔ انہوں نے قدیم تلمیحات کا دامن بھی نہیں چھوڑا۔ ان کے فکر و فن کا سفر فلسفۂ قدیم و فلسفۂ جدید کی ان متوازن قدروں سے ہم آہنگ ہے جنہیں مشرقی روایات سے الگ نہیں کیا جاسکتا (۵۲)''

''درسیات ہی نہیں؟ علامہ شاداں فن شعر اور لسانیات کے مسلم الثبوت ماہرین میں اپنا مقام رکھتے تھے۔ دیوان غالبؔ کی جو عالمانہ شرح انہوں نے تحریر فرمائی ہے اس کے بارے میں ارباب نظر کا خیال ہے کہ نظم طباطبائی کی شرح غالبؔ کے بعد

اسے سب سے زیادہ اہمیت ہے (۵۳)''

''حسینی نے صاحب نے اُردو ادب کو نیا افسانہ ہی نہیں دیا بلکہ ایک ایسے افسانوی شعور کی تکنیک سے روشناس کرایا جو اس صف کے افسانہ نگاروں میں نہیں ملتی۔ وہ کہانی کار نہیں تھے افسانہ نگار تھے اسی لیے جب پریم چند کی سماجی کہانیوں کا فسانوی تجزیہ کیا جاتا ہے تو حسینی، پریم چند سے بہت آگے نظر آتے ہیں (۵۴)''

نادمؔ کے تحریر کردہ خاکوں میں جہاں زیر موضوع شخصیات کے فن پر تنقیدی تبصرے ہمارے سامنے فن و ادب کے معیار کو پرکھنے کا ذریعہ بنے ہیں، وہیں نادمؔ کی تنقیدی صلاحیتوں کو جانچنے کا پیمانہ بھی بن گئے ہیں۔ نادمؔ اگرچہ بحیثیت تنقید نگار کے زیادہ شہرت نہیں رکھتے لیکن ان کے تحریر کردہ خاکوں میں ان کے تنقیدی تبصرے ان کی صلاحیتوں کے اظہار و جانچ کا بہترین اظہار ہیں۔

مجموعی تبصرہ

نادمؔ کے تحریر کردہ خاکوں میں ہمیں جہاں خاکہ نگاری کی گوناگوں خصوصیات ملتی ہیں وہیں یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اگر نادمؔ باقاعدہ خاکہ نگار کے طور پر سامنے آتے تو شاید ان کے خاکوں کا رنگ کچھ مختلف ہوتا۔ بہرحال نادمؔ کے خاکے اُردو ادب سے محبت رکھنے والوں کے لیے آج بھی اپنے اندر جاذبیت اور اہمیت رکھتے ہیں۔

حواشی:

(۱) http://sitapor.nic.in/history.htm سیتاپور کی سرکاری ویب سائٹ

(۲) نادم سیتاپوری، فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی (لکھنؤ: ادارۂ اُردو، مئی ۱۹۵۹ء)، ص ۹۷۔

(۳) نادم کی نامکمل اور غیر مطبوعہ خودنوشت سوانح عمری، جو ان کے ذاتی ذخیرے سے دستیاب ہوئی اور اب ان کے صاحبزادے ڈاکٹر عابد اظہر کے پاس محفوظ ہے۔

(۴) نادم سیتاپوری، غالب کے کلام میں الحاقی عناصر (لکھنؤ: ادارۂ فروغ اُردو، ۱۹۶۵ء)

(۵) نادم سیتاپوری، خیابان غالب (کراچی: مدینہ پبلشنگ کمپنی، ۱۹۷۰ء)

(۶) نادم سیتاپوری، غالب نام آورم (لکھنؤ: ادارۂ فروغ اُردو، ۱۹۶۲ء)

(۷) نادم سیتاپوری، فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی (لکھنؤ: ادارۂ فروغِ اُردو، ۱۹۵۹ء)

(۸) نادم کو اس کتاب پر یوپی حکومت کی جانب سے ۳۰۰ روپے کا نقد انعام دیا گیا تھا۔ قومی آواز لکھنؤ ۲۶ فروری ۱۹۶۱ء کی اشاعت میں اس کی تفصیلات شائع ہوئیں۔

(۹) نادم سیتاپوری، اکبر الہ آبادی کے لطیفے (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۵۵ء)

(۱۰) نادم سیتاپوری، رابندر ناتھ ٹیگور (لکھنؤ: ادارۂ فروغ اُردو، ۱۹۶۱ء)

(۱۱) نادم سیتاپوری، انتخابِ فتنہ (لکھنؤ: نسیم بکڈپو، ۱۹۶۲ء)

(۱۲) نادم سیتاپوری، تلخیص مقدمۂ ابن خلدون (لاہور: فیروز سنز، ۱۹۷۱ء)
(۱۳) نادم سیتاپوری، محل سرا (لکھنؤ: تنویر بکڈپو، ۱۹۵۹ء)
(۱۴) نادم سیتاپوری، ان سنی (بمبئی: مکتبہ سلطانی ابراہیم، ۱۹۴۶ء)
(۱۵) نادم سیتاپوری، شہانہ (لکھنؤ: نسیم بکڈپو، ۱۹۵۹ء)
(۱۶) نادم سیتاپوری، منجدھار (بمبئی: مکتبہ سلطانی ابراہیم، ۱۹۴۶ء)
(۱۷) نادم سیتاپوری، ہمارا پاکستان (بمبئی: مکتبہ سلطانی ابراہیم، ۱۹۴۶ء)
(۱۸) نادم سیتاپوری، مرحوم، مشمولہ نقوش لاہور (۱۹۶۳ء)، ص ۵۳۲۔
(۱۹) نادم سیتاپوری، محشر لکھنوی، مشمولہ طلوع افکار کراچی (مارچ ۱۹۷۱ء)، ص ۲۵۔
(۲۰) نادم سیتاپوری، جگر بسوانی، مشمولہ ہماری زبان علی گڑھ (مئی ۱۹۵۹ء)
(۲۱) نادم سیتاپوری، محشر لکھنوی، محولہ بالا، ص ۲۵۔
(۲۲) نادم سیتاپوری، اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں، مشمولہ طلوع افکار کراچی (مئی ۱۹۷۱ء)، ص ۲۲۔
(۲۳) نادم سیتاپوری، راجہ صاحب محمود آباد، مشمولہ روزنامہ مساوات کراچی (۶ نومبر ۱۹۷۴ء)
(۲۴) نادم سیتاپوری، مرحوم، محولہ بالا، ص ۵۳۲۔
(۲۵) نادم سیتاپوری، راجہ صاحب محمود آباد، محولہ بالا۔
(۲۶) نادم سیتاپوری، اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، مشمولہ ہفت روزہ عوامی عدالت کراچی (۵ ستمبر ۱۹۷۴ء)، ص ۷۔
(۲۷) نادم سیتاپوری، محشر لکھنوی، محولہ بالا، ص ۲۵۔
(۲۸) نادم سیتاپوری، اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں، محولہ بالا، ص ۲۱۔
(۲۹) نادم سیتاپوری، علامہ شاداں بلگرامی، مشمولہ طلوع افکار کراچی (جنوری ۱۹۷۱ء)، ص ۱۴۔
(۳۰) نادم سیتاپوری، ریاض خیرآبادی، مشمولہ طلوع افکار کراچی (جولائی ۱۹۷۱ء)، ص ۱۴۔
(۳۱) نادم سیتاپوری، محشر لکھنوی، محولہ بالا، ص ۲۵۔
(۳۲) نادم سیتاپوری، پہلا ہندوستانی کمیونیسٹ، مشمولہ ہفت روزہ عوامی عدالت کراچی (۵ ستمبر ۱۹۷۴ء)، ص ۷۔
(۳۳) نادم سیتاپوری، غریق سیتاپوری، مشمولہ مجلس لاہور (اکتوبر ۱۹۶۷ء)، ص ۴۶۔
(۳۴) نادم سیتاپوری، لکھنو کے چند ارباب کمال، مشمولہ طلوع افکار کراچی (اگست ۱۹۷۱ء)، ص ۳۲۔
(۳۵) نادم سیتاپوری، علی عباس حسینی، چند یادیں، مشمولہ افکار (نومبر ۱۹۶۹ء)، ص ۷۶۔
(۳۶) نادم سیتاپوری، مرحوم، محولہ بالا، ص ۵۳۲۔
(۳۷) نادم سیتاپوری، ریاض خیرآبادی، مشمولہ طلوع افکار کراچی (جولائی ۱۹۷۱ء)، ص ۱۴۔
(۳۸) نادم سیتاپوری، اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں، محولہ بالا، ص ۱۸۔
(۳۹) ایضاً۔
(۴۰) ایضاً۔
(۴۱) نادم سیتاپوری، اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں، محولہ بالا، ص ۲۲۔
(۴۲) نادم سیتاپوری، مرحوم، محولہ بالا، ص ۵۲۷۔
(۴۳) نادم سیتاپوری، علامہ شاداں بلگرامی، مشمولہ طلوع افکار کراچی (جنوری ۱۹۷۱ء)، ص ۱۳۔
(۴۴) نادم سیتاپوری، محشر لکھنوی، محولہ بالا، ص ۲۶۔

(۴۵) نادم سیتاپوری، افسر الشعرا آغا شاعر دہلوی، مشمولہ الشجاع لاہور (مارچ ۱۹۶۳ء)
(۴۶) نادم سیتاپوری، جگر بسوانی، مشمولہ ہماری زبان علی گڑھ (مئی ۱۹۵۹ء)
(۴۷) نادم سیتاپوری، علامہ شاداں بلگرامی، محولہ بالا، ص ۱۳۔
(۴۸) ایضاً۔
(۴۹) نادم سیتاپوری، غریق سیتاپوری، مشمولہ مجلس لاہور (اکتوبر ۱۹۶۷ء)، ص ۴۶۔
(۵۰) نادم سیتاپوری، افسر الشعرا آغا شاعر دہلوی، مشمولہ الشجاع لاہور (مارچ ۱۹۶۳ء)
(۵۱) نادم سیتاپوری، ظریف لکھنوی، مشمولہ طلوع افکار کراچی (اگست ۱۹۷۱ء)، ص ۳۴۔
(۵۲) نادم سیتاپوری، مولانا مہر سے پہلی و آخری ملاقات، مشمولہ العلم کراچی (جنوری ۱۹۷۲ء)، ص ۱۶۔۱۷
(۵۳) نادم سیتاپوری، عبدالعزیز خالد، مشمولہ تحریریں لاہور، ص ۲۳۰۔
(۵۴) نادم سیتاپوری، علامہ شاداں بلگرامی، محولہ بالا، ص ۱۴۔
(۵۵) نادم سیتاپوری، علی عباس حسینی، چند یادیں، مشمولہ افکار کراچی (نومبر ۱۹۶۹ء)، ص ۷۳۔

مآخذ:

http://sitapor.nic.in/history.htm سیتاپور کی سرکاری ویب سائٹ
نادم سیتاپوری، اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں، مشمولہ طلوع افکار کراچی، مئی ۱۹۷۱ء۔
_____، افسر الشعرا آغا شاعر دہلوی، مشمولہ الشجاع لاہور، مارچ ۱۹۶۳ء۔
_____، اکبر الہ آبادی کے لطیفے، لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۵۵ء۔
_____، اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، مشمولہ ہفت روزہ عوامی عدالت کراچی، ۵ ستمبر ۱۹۷۴ء۔
_____، ان سنی، بمبئی: مکتبہ سلطانی ابراہیم، ۱۹۴۶ء۔
_____، انتخابِ فتنہ، لکھنؤ: نسیم بکڈپو، ۱۹۶۲ء۔
_____، پہلا ہندوستانی کمیونیسٹ، مشمولہ ہفت روزہ عوامی عدالت کراچی، ۵ ستمبر ۱۹۷۴ء۔
_____، تلخیصِ مقدمۂ ابن خلدون، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۷۱ء۔
_____، جگر بسوانی، مشمولہ ہماری زبان علی گڑھ، مئی ۱۹۵۹ء۔
_____، خیابان غالب، کراچی: مدینہ پبلشنگ کمپنی، ۱۹۷۰ء۔
_____، رابندر ناتھ ٹیگور، لکھنؤ: ادارۂ فروغ اُردو، ۱۹۶۱ء۔
_____، راجہ صاحب محمود آباد، مشمولہ روز نامہ مساوات کراچی، ۶ نومبر ۱۹۷۴ء۔
_____، ریاض خیرآبادی، مشمولہ طلوع افکار کراچی، جولائی ۱۹۷۱ء۔
_____، شہانہ، لکھنؤ: نسیم بکڈپو، ۱۹۵۹ء۔
_____، ظریف لکھنوی، مشمولہ طلوع افکار کراچی، اگست ۱۹۷۱ء۔
_____، عبدالعزیز خالد، مشمولہ تحریریں لاہور۔
_____، علامہ شاداں بلگرامی، مشمولہ طلوع افکار کراچی، جنوری ۱۹۷۱ء۔
_____، علی عباس حسینی، چند یادیں، مشمولہ افکار، نومبر ۱۹۶۹ء۔
_____، غالب کے کلام میں الحاقی عناصر، لکھنؤ: ادارۂ فروغ اُردو، ۱۹۶۵ء۔

_____، غالب نام آور م، لکھنؤ: ادارۂ فروغ اُردو، ۱۹۶۲ء۔
_____، غریق سیتاپوری، مشمولہ مجلس لاہور، اکتوبر ۱۹۶۷ء۔
_____، فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی، لکھنؤ: ادارۂ اُردو، مئی ۱۹۵۹ء۔
_____، لکھنو کے چند ارباب کمال، مشمولہ طلوع افکار کراچی، اگست ۱۹۷۱ء۔
_____، محشر لکھنوی، محولہ بالا۔
_____، محل سرا، لکھنؤ: تنویر بکڈپو، ۱۹۵۹ء۔
_____، مرحوم، مشمولہ نقوش لاہور، ۱۹۶۳ء۔
_____، منجدھار (بمبئی: مکتبہ سلطانی ابراہیم، ۱۹۴۶ء)
_____، مولانا مہر سے پہلی و آخری ملاقات، مشمولہ العلم کراچی (جنوری ۱۹۷۲ء)، ص ۱۶۔۱۷
_____، ہمارا پاکستان (بمبئی: مکتبہ سلطانی ابراہیم، ۱۹۴۶ء)